# ۵ اُردو کا ضبط شدہ ادب

## ظ۔انصاری

**جان پہچان**

ظ۔انصاری کا اصل نام ظل حسنین نقوی تھا۔ وہ ٦ر فروری ۱۹۲۵ء کو سہارن پور میں پیدا ہوئے تھے۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے میرٹھ کے مُجیبیہ کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مختلف اخبارات میں جن میں 'انصاری نامہ، قومی جنگ' اور 'روزنامہ انقلاب' شامل ہیں، خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ماہنامہ 'شاہراہ' اور ہفتہ وار 'آئینہ' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ظ.انصاری نے روس میں رہ کر متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ ممبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر بھی رہے۔ ان کی تصانیف میں 'کتاب شناسی، غالب شناسی، اقبال کی تلاش، خسرو کا ذہنی ارتقا' اہم ہیں۔ 'کانٹوں کی زبان' ان کے اداریوں کا مجموعہ ہے۔ درج ذیل اداریہ اسی کتاب سے لیا گیا ہے جو ۲۹ر مارچ ۱۹۸٦ء کو اخبار 'انقلاب' ممبئی میں شائع ہوا تھا۔ ظ۔انصاری اہم ترقی پسند ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۹۱ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

دو دن پہلے ہمیں بمبئی دوردرشن (ٹی وی) کے ایک پروگرام میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ عنوان تھا 'اُردو کی ضبط شدہ نظمیں'۔ اب تک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں آزادی کے اس ادب کا انتخاب کیا گیا ہے جو آزادی کی لڑائی کے دوران لکھا اور چھاپا گیا تھا۔ کوئی ۳۵ر برس پہلے مرحوم رسالے 'نیا ادب' نے ایک خاص نمبر اسی موضوع پر نکالا تھا۔ چند سال ہوئے کہ دو جلدوں میں 'ہندوستاں ہمارا' کے عنوان سے مرحوم جاں نثار اختؔر نے قومی روح رکھنے والا ادب یکجا کیا۔ حال میں علی جوادؔ زیدی نے 'ضبط شدہ نظمیں' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا جو اُردو ہندی دونوں رسم خط میں لکھنؤ سے چھپا ہے۔

ان سب کتابوں میں وہی ادب شامل ہے جو کتابوں اور رسالوں میں بکھرا پڑا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ ادب ہے جو اخباروں میں، اشتہاروں میں اور سینہ بہ سینہ گلیوں، محفلوں اور بازاروں میں پھیلا اور کتابوں تک نہ پہنچ سکا۔ اس میں ایسی تحریریں بھی تھیں جن کے مصنف گمنام جیے اور بے نام سِدھارے۔ ایسے بھی تھے جنھیں لکھنا اور اپنا نام پھیلانا نہیں آتا تھا مگر سینے میں آزادی کی جوالا دہک رہی تھی۔ کچّی پکّی شاعری کر لیتے تھے، سنا کر جی ہلکا کر لیتے تھے۔ لوگ محبت سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے، گاتے اور چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے تھے۔

ظفر علی خاں، شورؔش کاشمیری، چراغ حسن حسرؔت، محمد دین تاثیؔر، مخدوؔم محی الدین، سجاد ظہیر، رشید جہاں، سرشاؔر سیلانی جیسے نامور لوگ دنیا سے اُٹھ گئے جن کی اکثر تحریریں روزنامہ اور ہفتہ وار اخباروں کے ذریعے لاکھوں پڑھنے والوں تک پہنچیں۔ ان اہلِ قلم کی تحریروں کا بھی کافی حصہ وقتی اور ہنگامی ادب کے فائل میں دھرا رہ گیا۔ ان کے علاوہ مولانا امداد صابری اور خان غازی کابلی جیسے درجنوں ایسے جاں باز گزرے ہیں جنھیں اپنی تحریروں کو مانجھنے کا بھی وقت نہیں ملا اور ہنگامی ادب کی فہرست تک میں ان کے نام نہیں ملتے۔ جب کوئی قوم، انسانوں کا کوئی گروہ سیاسی، سماجی یا تہذیبی بندھن توڑنے کے لیے اُٹھتا ہے تو ادب سے اس کا دو گونہ رشتہ بن جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ادب اگلی منزل کی نشاندہی کرے، تشویق کرے، بہتر قدروں کا مشتاق بنائے اور وقت سے دو قدم آگے چلے۔ دوسرے یہ کہ وقت کی ترجمانی کرے، آواز میں آواز ملائے اور اس کے نقشِ قدم اپنے ورقوں پر محفوظ کر لے۔

دونوں قسم کی تحریریں، تصنیفیں اپنے وقت پر غیر معمولی اہمیت اختیار کرلیتی ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد اگر ان میں کوئی فنی خوبی ہوتو زندہ رہ جاتی ہیں ورنہ پرانی یادوں کے ساتھ رخصت ہوجاتی ہیں۔ یہ صرف ہندوستان میں نہیں، سبھی ملکوں میں ہوا ہے، سبھی زبانوں کے ساتھ یہ بیتی ہے۔

جس دن ہندوستان میں اُردو پریس نے جنم لیا، اسی دن سے ضبطی کے سرکاری نوٹس کے درشن بھی کیے۔ اب اُردو اخبار نویسی کی عمر ڈیڑھ سو سال سے اوپر ہوگئی اور کم از کم اتنی ہی تعداد اُن لکھنے والوں کی ہے جو قبل از اشاعت سنسرشپ، زرضمانت کی ضبطی، اخبار، کتاب، نظم یا مضمون کی سرکاری ضبطی سے گزرے اور گزرتے رہے۔ لکھنؤ، لاہور، کلکتہ اور بمبئی ترتیب وار ان ضبطیوں کے مرکز رہے ہیں۔ اکبرالٰہ آبادی کا مشہور شعر ہے ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

'ضبطی' کا قافیہ 'خبطی' محض اتفاقی نہیں، یہ اکبر کے زمانے میں زبان زدِ خاص و عام تھا۔ سرکاری ملازم اور خوش حال زمینداروں کا جو کوئی ذہین اور پرجوش بیٹا آزادی کی ہنگامہ خیز تحریک میں کود پڑتا یا انقلابیوں کی صحبت میں پڑ جاتا، اُسے 'خبطی' کا خطاب ملتا تھا اور یہ کہہ کر چڑایا جاتا تھا کہ وہ 'ضبطی' کی راہ پر لگ گیا ہے۔

کسی تصنیف، نظم، نثر یا تحریر کا بحقِ سرکار ضبط ہوجانا ایک فریق کے لیے عزت کی اور باقی دو کے لیے اذیت کی بات تھی۔ مصنف تو نام کماتا، ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر مالی نقصان اُٹھاتے۔ بعض اوقات ایڈیٹر اور مصنف دونوں ایک ہی شخصیت ہوتی تھی جیسے منشی پریم چند، ظفر علی خاں، مہاشے کرشن، حسرتؔ موہانی، آغا شورش، سیّد جالب، عبدالرزّاق ملیح آبادی، دیوان سنگھ مفتونؔ اور بمبئی کے حافظ علی بہادر خاں۔ اس صورت میں یا تو وہ کسی نوعمر اور نومشق کو 'قربان گاہ' کے لیے نامزد کردیتے۔ یوں نامزد ہونا بھی عزت کی بات تھی۔ بعض ایڈیٹر ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے ضبطی کا وار سینے پر لیا اور مصنف کو اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا۔

۱۹۰۸ء میں مولانا حسرتؔ موہانی نے 'اُردوئے معلّٰی' رسالے میں ایک طویل مضمون چھاپا: 'مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'۔ حکومت یوپی نے ان سے سوال جواب کیا۔ مولانا نے مصنف کا نام نہ بتایا۔ حکومتِ ہند سے آرڈر آیا کہ مضمون نہایت قابلِ اعتراض ہے۔ ایڈیٹر کو سزا دی جائے۔ مولانا نے جیل کاٹی۔ ان کا رسالہ بند ہوا۔ پریس کو تالا لگ گیا، کتابیں چھکڑے میں بھر کر ردی کے بھاؤ نیلام کردی گئیں اور مولانا 'خبطی خالہ' کے لقب سے سارے علی گڑھ میں مشہور ہوگئے۔ آج مولانا حسرتؔ کی تحریروں کا اچھا خاصا سرمایہ پائندہ ادب کے سرمایے میں گنا جاتا ہے۔

یہ ضبطیاں انگریزی راج کے زمانے میں عام طور سے ان تحریروں کی ہوا کرتی تھیں جن سے بوئے بغاوت آتی ہو۔ ان میں ادبی معیار یا مصنف کے وقار کا کوئی سوال نہ تھا لیکن 'ضبطی' کی ایک اور قسم بھی ۱۹۲۲ء کے بعد منظر پر اُبھری۔

گاندھی جی نے جب چورا چوری کے حادثے کے بعد جس میں پولس والے سمیت ایک تھانہ جلا دیا گیا تھا، قومی آزادی کی اُبلتی ہوئی دیگ پر ڈھکنا رکھ دیا، تحریک اچانک بند کردی تو خون کی حدت میں فساد کے سلسلے کی شروعات ہوئی اور فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کی تحریریں پے در پے چھپنے لگیں۔ قومی درد کے بیمار چیختے تھے کہ یہ خرافات بند کی جائے۔ کونسل بیٹھتی تھی اور دو چار ہفتے بعد اشتعال

پھیلا چکنے کے بعد سرکاری عہدے دار اسے ضبط کر لیتے تھے۔ ضبطی کا اعلان ہوتے ہی اس تحریر کی مانگ اور بڑھ جاتی تھی اور یوں ضبطی بھی بعض انگارے کھانے، آگ اُگلنے والوں کی تجارتی غرض کے لیے کارآمد ثابت ہوتی تھی۔

افسوس کہ ضبط شدہ تحریروں کا یہ سیاہ سلسلہ پھر رواں ہوا ہے۔ جس قومی آزادی کی بھٹی میں ایندھن ڈالنے کے لیے آزادی پسند اہلِ قلم نے اپنی ہڈیاں جلائیں، اپنی کتابیں جلوائیں، اپنا گھر بار پھونکا، آج اسی آزادی کی جلوہ افروزی کے کوئی پچاس برس بعد بار بار ایسی تحریروں کی ضبطی کی مانگ اُٹھتی ہے جو تحریریں دل آزاری اور فرقہ وارانہ توہین بلکہ گالم گلوج کی غرض سے کاغذ کا منہ دیکھتی ہیں۔

کلکتے میں ایک صاحب نے 'اسلام کا مردہ ہاتھ' نامی مضمون شائع کر دیا۔ اس کی نقلیں ہزاروں کی تعداد میں مفت بانٹی گئیں۔ اِدھر اُدھر سے روز ایسی خبریں آتی ہیں۔ ان خبروں سے بعض کم سمجھ لوگ اشتعال میں آجاتے ہیں اور یوں دَریدہ دہن اور بدنیت مصنفوں کی کاری گری کا اوزار بن جاتے ہیں۔

'اِسے روکو، اُسے ضبط کرو' کی صدا بلند نہ کی جائے تو اِن سستے پٹاخوں کو کوئی پوچھے بھی نہیں۔ یہ پٹاخے، غیر ادبی، غیر علمی اور نامہذب تحریروں کے رڈی پلندے سرِ بازار چھوڑے ہی جاتے ہیں اشتعال دلانے کی نیت سے۔ ان سے مشتعل ہو جانا بجائے خود نادانی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ کس منہ سے کہیں کہ ہماری زبان کے اخبار اور ہماری برادری کے شہرت پسند بھائی ان اشتعال انگیزیوں کا شکار ہونے میں اوروں سے زیادہ جلد باز نکلتے ہیں۔ ہمیں تو زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔

## مشقی سرگرمیاں

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ ضبط کی گئیں کتابوں میں جس قسم کا ادب شامل تھا، اس کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ ہنگامی ادب لکھنے والوں سے متعلق معلومات دیجیے۔

۳۔ سماجی اضطراب اور بغاوت سے ادب کا تعلق بیان کیجیے۔

۴۔ تحریروں کی اہمیت حاصل کرنے کی وجہ اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیجیے۔

۵۔ اشتعال انگیز تحریروں کے نقصانات واضح کیجیے۔

۶۔ مولانا حسرتؔ موہانی کے 'خبطی خالہ' کے لقب سے مشہور ہونے کا واقعہ لکھیے۔

۷۔ ظ۔ انصاری کے اداریوں کے پیشِ نظر صحافت میں اداریے کی اہمیت واضح کیجیے۔

* ذیل کی سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ ''اِسے روکو، اُسے ضبط کرو'' کی صدا بلند نہ کی جائے تو ان سستے پٹاخوں کو کوئی پوچھے بھی نہیں۔ اداریے کے اس جملے کی روشنی میں غیر ضروری خبروں اور باتوں کی تشہیر سے متعلق اپنی رائے لکھیے۔

۲۔ اُردو زبان کے اخبار اور شہرت پسند بھائی اشتعال انگیزیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ظ۔ انصاری کے اس بیان کی روشنی میں اخباری خبروں کا تجزیہ کیجیے۔

**سرگرمی/منصوبہ**

۱۔ کوئی تین اخباروں سے اداریے نقل کیجیے اور ہر اداریے سے متعلق اپنی ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

۲۔ کسی ایک روزنامے کے مختلف کالموں کا البم تیار کیجیے اور ہر کالم پر تبصرہ لکھیے۔